دل کا اصلی من بھاتا کھاجا وہم و گمان ہی تو ہے۔ارجمند کی بات سن کر مجھے کئی خیال آئے۔۔۔شاید اقبال کو علم ہو کہ ارجمند میری بیٹی ہے۔۔۔۔۔۔لوگ کہتے ہیں ارجمند کی شکل وصورت مجھ پر پڑی ہے۔عورتوں کو ویسے بھی رشتوں کی پہچان میں دیر نہیں لگتی،وہ کڑی ملا کر لکڑ دادے تک آسانی سے پہنچ جاتی تھیں۔ٹرین کے چند گھنٹوں کا سفر عمر بھر کے بہانے پر منج ہوسکتا ہے۔ہسپتال میں دو ایک مرتبہ مریض کی عیادت کے بعد عورتیں سہیلیاں بن جاتی ہیں۔مرد بیچارے رشتوں کے معاملوں میں کوڑھ دماغ ہوتے ہیں کبھی کبھی ساری عمر انہیں بھانجی اور بھتیجے میں فرق نظر نہیں آتا اور وہ ان دو لفظوں میں گھپلے ڈالتے رہتے ہیں۔

''آپ کیا سوچ رہے ہیں لالو۔۔۔اگر آپ پریشان ہیں،تو میں جاپان نہیں جاتی۔''

''نہیں نہیں ٹھیک ہے تم فکر نہ کرو بالکل۔۔۔۔''

''ویسے میں انہیں پھر فون کروں گی۔واپسی پر خود واشنگٹن جا کر انہیں ملیں گے آپ کو آنٹی بہت اچھی لگیں گی ابو۔۔۔آپ کے زمانے کی ہیں ناں۔۔۔۔سارے دن Values پر بولتی رہتی ہیں How Cute انکل نثار البتہ بہت Sherwed ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ہر عہد اپنی Value فکس کرتا ہے۔آنٹی کا منہ لال شقندر ہو جاتا ہے۔وہ ہر بار Temperloose کر کے کہتی ہیں۔۔۔۔نہیں نثار جو اقدار نبی بتا گئے وہ کبھی بدلتیں۔۔۔۔۔وہ foralltimes ہوتی ہیں۔۔۔۔''

''ہاں بیٹا۔۔۔۔۔کچھ ایسے ہی ہے۔۔۔۔۔''ہماری جنریشن گھوڑی سی ہٹ دھرم کچھ کچھ پاگل ہے۔

''لیکن اگر انسان ایسی جکڑ بند Value سسٹم میں بندھ جائے تو پھر ترقی کیسے

کرسکتا ہے ابو۔۔۔کچھ رسم ورواج کچھ اقدار ضروری ہر عہد میں بدلتیں ہیں۔۔۔ہیں ناں؟"

"رسم رواج تک تو ٹھیک ہے ارجمند۔۔۔لیکن اصل Values۔۔۔کبھی نہیں بدلتیں۔۔۔میں اخلاق اقدار کی بات نہیں کر رہا۔میں ان بنیادی حقائق کا ذکر کر رہا ہوں جو تمام مذاہب میں ایک سی ہیں اور نبی ان کی شہادت دیتے ہیں"

"مثلاً۔۔۔"

"مثلاً جھوٹ۔۔۔ماں باپ کی عزت۔۔مثلاً سارے معاملات میں کھرا پن۔۔۔"

اس نے کچھ ایسے سر ہلایا جیسے میں کوئی فرسودہ بات کر رہا ہوں۔میری بات انتی پٹی ہوئی کلیشے زدہ تھی کہ اس نے مجھ سے آگے چلنا شروع کر دیا اور گفتگو منقطع کر دی۔

میں نے دل میں سوچا کہ واقعی اگر انسان اقدار سے نتھے ہو جائے تو ترقی کا بہت گھر سے باہت پھینکنا پڑتا ہے۔

میں نے ارجمند کو بتانا چاہا۔۔۔بہر کچھ اپنے متعلق۔۔۔اقبال کے بارے میں اس مبہم تعلق کی باتیں جس کا کوئی ثبوت نہ تھا۔۔۔پھر سوچا کہ فقیر لوگ کہا کرتے ہیں جس درجے کی توفیق نہ ہو اس کا اعلان نہیں کرنا چاہیے۔۔۔میں کسی قسم کی محبت کا اعلان کیونکر کرسکتا تھا۔۔۔ایسا دھیڑ بن میں گھر پہنچا اور سوچتا چلا گیا کہ اقبال سے میرا کیا سمبندھ۔۔۔؟ بھلا اس تعلق کو انسان کس نام سے پکار سکتا ہے۔۔۔۔؟

ارجمند اور بلال کے جاپان رخصت ہو جانے کے بعد میں بچوں کے کمرت میں شفٹ ہو گیا۔فرمانبردار بچے سارا دن کی بھاگ دوڑ سے تھکے ہوئے تھے،تھک کر جلد سو گئے۔میں نے نین کو بلانے کے بڑے جتن کیے۔آئیس کریم کھائی۔دودھ پیا۔۔۔کئی قسم کے لیمن ڈراپ چوسے۔اونگھ آجاتی تھی لیکن نین کوسوں دور تھی

۔بوڑھے لوگ عام طور پر آدھی رات کو جاگ جایا کرتے ہیں ۔پھر ان کی موتیا سے بند ہوتے قورنیا کو تو کچھ واضح نظر نہیں آتا لیکن اند کی آنکھ کھلی رہتی ہے۔۔۔۔

تعلق کیا چیز ہے؟

یہ بھی حسیات سے تعلق رکھنے ولی غیر مرئی خوبیوں میں سے ایک کیفیت ہے جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے۔لیکن سمجھانے پر آئیں تو سمجھا نہیں سکتے ۔ماں کی محبت یا تعلق کو ماما کہہ کر واضح نہیں کر سکتے ۔ڈکشنری میں یا لٹریچر سے اس کی وضاحتیں ملتی ہیں، مامتا نہیں ملتی ۔جہاد پر جان سے گزر جانے والے بہادر کا حصہ نہ بن جائیں ۔تعلق زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے صبر کی مانند ایک ڈھال ہے۔جب کبھی جہاں بھی کسی سچا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، وہاں قناعت ،راحت اور وسعت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے ۔آپ کو اندر یہی اندر یہ یقین محکم رہتا ہے کہ آپ کی آگ میں سلگنے والی کوئی دوسرا بھی موجود ہے۔۔۔دوہرا وزن آدھارہ جاتا ہے۔

تب میں اتنا سوچنے والا نہ تھا ۔ہال روڈ کی چھوٹی سی دوکان پر شاہد بھائی کے ساتھ کام کرنا پرائیویٹ بی اے کی تیاری میں مصروف رہنا اور اپیا کی عمر میں چھوٹی سہیلی اقبال کا بل وجہ انتظار کرتے چلے جانا میرے مشاغل تھے۔اقبال کی سوچ ہمیشہ میرے ساتھ تارچ کی روشنی بجھ جاتی لیکن اندھی یاد کی بیٹری بھی ساتھ رہتی اس کی دید ہی سے میرے بیٹری چارج ہو جاتی تھی ۔میں خود اس تعلق کو کبھی سمجھ نہ پاتا ۔ایک روز میں آپیا کے کمرے میں گیا تو سامنے پلنگ پر اقبال بیٹھی کوئلس لگا رہی تھی ۔تب ماڈرن لڑکی ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ وہ چوری چھپے کے بجائے اعلانیہ کیوٹکس لگانے لگی تھی۔

''آپیا کہاں ہیں؟۔۔۔۔۔''

''امی جی نے بلایا ہے کچن میں''

میں پلنگ کے کنارے وسوسوں کا شکار کسی نوبیاہتا کی طرح کبا سا ہو کر بیٹھ گیا۔

''کبھی آپ نے ایسا تعلق محسوس کیا ہے کہ۔۔۔۔کسی شخص کی غیر موجودگی میں زندگی خالی خولی ماچس کی ڈبیا بن جائے۔۔۔۔''میں نے پوری توجہ کے ساتھ ٹھاہ کے انداز میں سوال کیا۔

اس کشمیرن نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔''کیا آپ ایسے تعلق سے آگاہ ہیں؟''

میں حیران رہ گیا۔ایف اے کی طالب سے ایسا سوال حیران کن تھا؟۔

شاید اس نے اپنی سائیکلوجی کی کتاب سے کچھ اس نوعیت کا پڑھا ہوا۔میں تو خیر شاعری کرنے کے باوجود تعلق کی بولی کم کم سمجھتا تھا اور شاعری میری سوچ کا کچھ نہ بگاڑ سکی تھی۔بس بے وزن حادثاتی شعروں سے کاپیاں بھری رہی تھیں۔

''میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں۔۔۔۔۔اگر آپ کے پاس وقت ہو تو۔۔۔۔''

میرے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔نوبیل پرائز سے بھی بڑا۔۔۔۔

''میں تب گیارہ برس کی تھی۔۔۔۔ہم اپنی خالہ کے پاس پہاڑوں پر گئے ہوئے تھے۔گرمیوں کا موسم تھا۔آپ کو معلوم ہے ناں کہ پہاڑوں پر گرمی میں جب پتھ تپ جاتے ہیں تو عجیب قسم کی گرمی لگتی ہے۔چبھنے والی سوئیاں جیسی۔آنکھیں چلچلاتی دوھپ میں چندھیانے لگتی ہیں۔میں اپنی کزن واجدہ کے ساتھ گھومنے پھرنے جاتی تو تیز دھوپ میں میری آنکھیں بند ہو جاتیں۔آپ سن رہے ہیں ناں''

''جی۔۔۔۔غور سے۔۔۔۔اقبال''میں اپنے آپ کو بادلوں میں محسوس کر رہا تھا۔

''آپ کو شاید یاد ہو کہ۔۔۔۔اس زمانے میں جاپان سے ایسے کلینڈر آیا کرتے تھے۔۔۔۔جن پر گوری چٹی نازک سی جاپانی لڑکیاں نازک نازک نقش و نگار کی چھتریاں اٹھائے دکھائی جاتی تھیں۔۔۔۔۔''

''میرے پاس ابھی تک ایک ایسا ہی کلینڈر ہے۔۔۔۔۔شاید وہ لڑکی چینی ہے شاید جاپانی ہو۔۔۔۔کیلنڈر والی لڑکی'' میں نے ہنگارا بھرا۔

''میرے پلنگ کے پاس والی دیوار پر ایک ایسا ہی کیلنڈر تھا جس میں چیری کے شگوفوں میں ایک جاپانی لڑکی چھتری لگائے مسکرا رہی تھی۔۔۔۔مجھے ایسی چھتری کی تلاش لگ گئی۔بڑی بے قراری کے ساتھ میں نے امی سے چھتری کی فرمائش کی تو وہ مجھے بازار لے گئیں۔لیکن بارش سے بچنے والی کالی چھتری تو ملیں۔'' بانس کی کمچیوں والا چھاتا نہ ملا۔۔۔وہ نظریں جھکا کر بولتی چلی گئی۔میں حیران اقبال کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور وہ پوری توجہ کے ساتھ کیوٹکس لگاتی واقعہ میں گم بولے جا رہی تھی۔ابھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی فرینک نس بھی عام نہ ہوئی تھی۔

''آپ کو تو پتہ ھی ھوگا۔پہاڑوں پر ان دنوں ایسے چائنا مین آیا کرتے تھے جن کے پاس چینی دستکاری کا بکاؤ مال ہوتا تھا۔ایک روز ہم گھر پہنچے تو خالہ اور امی کے سامنے ایک چائنا مین جیسے جادو کی صندوقچی کھولے بیٹھا تھا۔اس کے پاس نازک کڑھائی کے بیڈکور Dollies Duchess Set' گدیاں' رومال' سکارف نہ جانے کیا کچھ تھا۔ Pastel Shades میں کڑھائی کا کام پوری جادوگری تھا۔ شیڈ ورک' Lazy Daisy ٹانکے میں نازک نازک پھول شاخیں پتیاں۔۔۔خالہ اور امی تو دیکھنے دکھانے میں مصروف تھیں لیکن میری نظر اس چھتری پر جمی رہ گئی جسے کھولنے پر بانس کے پتوں اور شاخوں کا ایک جال سا سارے چھاتے پر پھیل جاتا۔''

''تو ۔۔۔آپ کو اپنی پسند کی چھتری مل گئی بالآخر ۔۔۔'' میں نے اپنی پسند پر زور دیا۔

''جی بالکل بالکل ۔۔۔اب اس دن کے بعد میں جہاں بھی جاتی' یہ چھتری میرے ساتھ ہوتی۔ اس نے مجھے واجدہ سے' واجدہ کی سہلیوں سے منفرد کر دیا تھا ۔۔۔ایک روز پتہ ہے کیا ہوا ۔۔۔''

''ہاں تو کیا ہوا ۔۔۔؟'' میرا تجسس بڑھا۔

''ہم دونوں یعنی میں اور واجدہ ترائی کی طرف جا رہی تھیں ۔ہمارے ساتھ اور بہت سی لڑکیاں تھیں' خالہ تھیں ۔ہم سب پکنک منانے جا رہے تھے۔ ہوا میں چیڑ کے درختوں کی خوشبو تھی ۔پھر اوپر پہاڑ کی جانب سے ایک چائنا مین تیزی سے اترا اور سب کو چھوڑ کر میرے پاس آ گیا''

''آپ کے پاس ۔۔۔وہ کیوں'' میں کچھ مضطرب ہو گیا ۔۔۔نہ جانے تعلق کی یہ کونسی گنجل تھی۔

میں نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا ۔ہاں Johny تمہیں کیا چاہیے ۔۔''

وہ مسکرایا اور بالا ۔۔۔'' مجھے کچھ نہیں چاہیے ۔۔۔میرا سارا سامان بک گیا ہے اور میں کل شنگھائی واپس جا رہا ہوں ۔۔۔آپ کی والدہ کیسی ہیں؟''

اس چائنا مین نے انگریزی میں سوال کیا۔ یکدم مجھے خیال آیا کہ وہ تو وہی چینی تھا جس نے امی کو بہت سی چیزیں بیچی تھیں ۔میرے لئے چھاتا بھی لیا تھا۔

''لیکن آپ نے مجھے کیسے پہچانا ۔۔۔''

''اس چھتری سے ۔۔۔اور کیسے؟ ۔۔۔''

''اچھا اچھا ۔لو مجھے خیال ہی نہ آیا'' حالانکہ مجھے بہت پہلے اس بات کا خیال آ چکا تھا کہ یقیناً اس جونی نے چھتری ہی کی وجہ سے اقبال کو پہچانا ہو گا۔

''پتہ ہے پھر کیا ہوا؟''

''جی بتائیے؟۔۔۔۔۔''

اس چائنا مین نے جیب سے رومال نکالا۔ ہلکے بادامی رنگ کا نازک سا رومال۔ اس پر Draw String کی کشیدہ کاری تھی۔ پھر دعا مانگنے کے انداز میں ہاتھ اٹھائے اور بولا۔۔۔۔یہ میں آپ کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔۔۔یہ اعتراف ہے کہ آپ نے جس طرح میری ماں کی بنائی ہوئی چھتری کو پسند کیا۔اس کے لئے میں بھی ہمیشہ شکر گزار ہوں۔یہ تعریف ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔۔۔آپ جانتے ہیں۔وہ رومال ابھی بھی میرے پاس ہے۔۔۔۔میں جانتی ہوں بے نام تعلق کیا ہوتا ہے۔۔۔۔''

میں سمجھا نہیں اقبال۔۔۔۔''

''تعلق چھتری ہوتی ہے۔۔۔۔زندگی کی کڑی''

بانس کے دھوپ میں اس کے پیچھے جائیے۔اداسی ہو تو اسے کھول کر سجا لیجیے۔ہر طرف بانس کے درختوں کا احساس ہوگا۔پہاڑوں کے کمرے میں ڈرانے والا بندر آجائے تو اس چھتری سے بھگا دیجیے کبھی آپ نے غیر ضروری بندر کو کمرے سے بھگایا ہے۔۔۔پہاڑوں پر تو ہم عام طور پر اسی چھتری سے بندروں کو بھگایا کرتے تھے ۔۔۔۔کسی ایک سے تعلق پیدا ہو جائے تو وافر شرارتی بندروں کو بھگانا بھی تو پڑتا ہے ناں۔۔۔۔''یہ بات بھی مجھ کو دن شاعر کے لیے نئی تھی۔

اقبال بڑی شاعرانہ سی گفتگو کر رہی تھی اور میری جانب ہولے ہولے بڑھتی آرہی تھی لیکن اس وقت آپیا آگئیں۔۔۔۔''لو بھئی تمہارے لیے ومنٹو بھیجی ہے اماں نے ۔۔۔۔میں کچھ میں گئی تو کہنے لگیں ذرا یہ شامی کباب تو بنا دو میں تھک گئی ہوں ۔۔۔۔سارے میں پھیلی ایوننگ ان پیرس کی خوشبو ماند پڑ گئی اور ومٹو کی مہک سے کمرہ بھر گیا۔

چائنا مین کی مہربانی سے ہم دونوں تعلق کے امداد میں تو داخل ہو گئے تھے لیکن اس

کے مرکز تک پہنچ نہ پائے ۔اقبال اور آپیا عورتوں کا خاص صفحہ بن گئیں اور میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

وزیرو بلب کی روشنی میں جمشید اور قیصر کو نیند کی آغوش میں بے سدھ سوتا چھوڑ کر میں تعلق کے سفید گھوڑے کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا ۔خیال کے Lasso سے تعلق کا برّاق پکڑنا مشکل تھا لیکن میں پھر بھی بھاگتا چلا گیا۔

جس طرح اللہ کی بنیادی ننانوے صفات کو جان کر بھی اللہ کا ادراک ناممکن ہے کلی طور پر اس ذات باری تعالیٰ کی ہمیں سمجھ آجائے یہ خیال خام ہے ۔ایسے ہی اقبال سے تعلق کو میں سمجھ نہ پایا تھا۔وہاں سب کچھ تھا اور کچھ بھی Tangible نہ تھا

اقبال مکمل طور پر میری جنت بھی نہیں تھی ۔یہاں بھی میرا تعلق ادھورا تھا ۔اس نے میرے ساتھ کچھ share نہیں کیا۔میری کسی مصیبت مین وہ میرے ساتھ نہ تھی ۔خیال کی حد تک کبھی کبھی میں اس کے اردگرد کہانیاں بن لیتا ۔۔۔۔لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا ۔۔۔اور پھر بھی ۔۔۔۔اور اسی طرح ۔۔۔۔اور کیا کہیں کی حالت میں وہ میرے ساتھ رہی ۔محبت شفقت ہمدردی، عشق تر و تازہ ہوں تو غم غم نہیں رہتا۔لیکن کبھی کبھی اگر سارے رشتے ٹوٹ بھی جائیں ار آئینہ دل میں کوئی شبیہ باقی نہ رہے تو بھی ایسا اوقات غم کا پہاڑ اسی تعلق کے بل ڈوزرے سے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے ۔ایسی کیفیت کو انسان نے آزادی کا نام دے رکھا ہے اور اس لیے کئی بار محبت کے بجائے آزادی کے پنکھ لگا کر اڑنے لگتا ہے ۔لیکن بندے کی دوئی کو کیا کیجیے اس کی خوبی ہی اس کی خرابی اور اس کی خرابی ہی اس کی خوبی ہے ۔اس کے قلب میں سدا بہار حق و باطل کی جنگ جاری رہتی ہے ۔وہ من وتو کے جھگڑوں سے نکل نہیں سکتا۔بتوں کو توڑتا توڑتا نڈھال ہو جاتا ہے لیکن بتوں کی Logistics ختم نہیں ہوتی ۔۔۔۔ایسے ہی آزادی اور محبت کے درمیان پنڈولم کی طرح پھرنا بھی اس کی

اپنی دوئی کا ہی فریب ہے۔۔۔۔۔

میں کبھی آزادی کی خودفریبی اور محبت کی پائیداری کا مزہ تو نہ چکھا تھا۔ مجھے یہ دونوں تلواریں ہی نہ ملی تھیں جن سے میں زندگی سے معرکہ آرا ہوتا۔۔۔۔لیکن میں تعلق کی چھتری کو شاید کچھ کچھ جانتا تھا۔ کبھی میں اس پر بنے ہوئے بیل بوٹوں میں کھو جاتا اور کبھی اس کو تان کر مینہ کنی سے بچنے کی کوشش کرتا۔ تعلق کی عملی شکل اصغری تھی

تعلق کا عملی پہلو ذمہ داری ہے۔ جہاں بھی کوئی رشتہ ناطہ ہو وہاں ذمہ داری کا احساس از خود پیدا ہونے لگتا ہے۔ سالوں پر محیط رابطے عام خیر سگالی اور دکھ سکھ میں شریک ہونے کے عملی ثبوت ہوتے ہیں دامے درمے سخنے مشکل کی گھڑی میں کام آنے کی روایت تعلق کا عملی پہلو بن کر۔۔۔اصغری میرے ساتھ رہی۔۔۔ہم دونوں اصلی معنوں میں شریک حیات رہے۔ شادی بیاہ کی رسومات جم مرن کے حادثات گھریلو واقعات میں ہماری سانجھ رہی۔۔۔۔ورق وقر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ذمے داری کی عینک سے پڑھا۔

لیکن میں اصغری کو اقبال والا صفحہ کبھی نہ دکھا سکا۔ اس کورے کاغذ پر کوئی تحریر نہ تھی ۔نہ سنانے کو کچھ تھا نہ کسی قسم کے سوگ میں اصگری کو ڈبونے کی ضرورت تھی۔

اصغری اور اقبال کے تعلق کی دوئی کے متعلق سوچتا، محبت اور آزادی کے تضاد کو شتارتا ہوا ترقی اور فلاح کی دوئی میں ڈوب گیا۔ مجھے یہ دونوں بھی زوج صورت نظر آئے میں نے جانا کہ ترقی کرنے والوں کے لیے دوسروں سے تعلق اتنا ضروری نہیں ہوتا جس قدر Self Love اہم ہے۔ جب تک ترقی کا آرزومند اپنی ذات کو اپنی خواہش کو Priority نہ دے وہ آگے بڑھ نہیں سکتا۔۔۔۔۔وہ کیسا لگتا ہے، کیا کھاتا ہے، کہاں رہتا ہے، اس کی ذات کی پرستش میں پورے کے پورے مارکیٹ سروس پر

لگے ہیں ۔بیوٹی پارلر ورزشوں کے ٹھکانے ،جوگنگ ،پلاسٹک سرجری کی ہلاشیری پر مامور ہیں کپڑوں کی ساری نیشنل اور ملٹی نیشنل انڈسٹری ،جوتوں کا کاروبار،بازار در بازار اس کی ذات کو چمکانے پر آمادہ رہتے ہیں ۔جب ذات مور پنکھ لگا کر نکلتی ہے تو معیار زندگی اونچا کرنے کا بھوت بھی Self Love پر سوار ہو جاتا ہے،بہتر گھر ،بڑی کار گھر میں سجا فرنیچر ذات کی جیب میں اسٹکبار کا گولڈن کارڈ ایسی گفتگو جو اپنی کوشش ،محنت اور دولت کو کامیابی کے بینک بیلنس کے طور پیش کرے ۔ایسے وقت میں جب ترقی کا بھوت نہ جینے دے نہ مرنے دے ۔ترقی اور فلاح میں جنگ بن کر دو تلواریں آپس میں ٹکراتی ہیں ،انسان ایک بار پنڈولم کی صورت کبھی ادھر کبھی اُدھر بھٹکنے لگتا ہے ۔

فلاح میں انسان تعلق تلاش کرتا ہے ۔

ترقی میں ذات پر بھروسہ کی ضرورت ہوتی ہے ۔تعلق راستے کا روڑہ بن سکتا ہے ۔

فلاح میں انا راستے کا بند پھاٹک ہے ۔

ترقی مین انا کی پھن اٹھائے بغیر کسی کو ڈسا نہیں جا سکتا ۔

فلاح مین اشیا کی تلاش تعلق کی موت ہے ۔

ترقی میں اشیا لاؤلشکر کی طرح کوئی دائیں سے حملہ آور ہوتی ہے کوئی بائیں سے اشیا کو میسر اور میسنا کی طرح سجا کر انسان ترقی کے کارزار میں محفوظ محسوس کرتا ہے ۔

فلاح خواہش کی پنیری کو مجاہدے ،ریاضت صبر سے نکالتی ہے اور تعلق درخت کو تن آور کرتی ہے ۔

ترقی خواہشات کے بغیر ایک قدم نہیں چلتی ۔ان ہی خواہشوں کے پٹرول سے ترقی کی گاڑی چلتی ہے ۔۔۔۔۔

جمشید اور قیصر بے سدھ ایک دوسرے میں جکڑے سو رہے تھے اور مجھ پر سوچوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔

میں نے سوچا ڈراصل آج کا عہد نہ سپیس ایج ہے نہ میڈیا Oriented ہے۔۔۔۔یہ وہ عہد ہے جب آزادی اور تعلق کے درمیان فاصلے بڑھ رہے ہیں فلاح کا عہد رخصت ہو رہا ہے ترقی کا دور آگے بڑھ رہا ہے۔ترقی جس کا علم آزادی ہے اور فلاح جو تعلق کا پھریرا لے کر چلتی ہے۔میں اس ترقی کے جھنڈے کو غور سے دیکھتا ہوں۔اس پر صرف ایک تیر بنا ہو جو آگے جاتا ہے۔چیرتا چلا جاتا ہے اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔

امریکہ نے اور ان کے دیکھا دیکھی تمام ترقی پذیر ممالک نے آزادی کے حق میں ووٹ دے دیا ہے۔۔۔۔کرنے مرنے کی آزادی۔۔۔۔۔ہر قسم کے تعلق سے نکل جانے کا عہد اپنی ذات کو سربلند ثابت کرنے کا عزم۔

امریکہ چونکہ ذات پر انحصار اور اس سے پیدا کردہ ترقی کا داعی ہے۔اس لیے وہاں آزادی اولین peiority ہے۔آزادی کے کیک پر تعلق کی آئیسنگ بھی لگی ہو تو بہت خوب ورنہ پلین کیک ہی چلے گا۔عام طور پر آزادی کی قینچی سے تعلق کی وہ تمام رسیاں کٹ جاتی ہیں جن سے

انسان بندھا ہوتا ہے تعلق چلتے ہیں،لیکن تادیر ان کو نبھانا اور کسی پر تکیہ کر کے زندگی بسر کرنا ناممکن نہیں۔جب اقتصادی ،جذباتی،نفسیاتی، Dependency ختم ہو جاتی ہے تو تنہائی کا چیتا گھر کی کھڑکیوں سے جھانکنے لگتا ہے،تعلق وقتہ ہو کر تضیع اوقات میں بدل جاتے ہیں اور مصرف انسان کو اندر کی زندگی سیراب کرنے کے لیے نت نئے چشمے نکالنے پڑتے ہیں۔پھر امرد پرستی کا جنون چلتا ہے۔ہم جنسوں کی شادیاں بھی قانونی ٹھہرتی ہیں

۔لوگ Punk بنتے ہیں۔گروہی ناچ گانا ،انفرمیشن ٹیلی ویژن ،انٹرنیٹ دوسرے ممالک کے سفر مختلف ریاستوں میں مختلف قسم کی روزگار کی تلاش ،اضطرب در اضطرب کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں اور گہرے تعلق کا تھم البدل تلاش کرنے مین وقت بھٹکتا رہتا ہے۔ایسے میں فلاح کی دیوی تعلق کا سفید جھنڈا لپیٹ کر رخصت ہو جاتی ہے۔

جمہوریت پسند امریکی ،اینٹی کرائسٹ اور اینٹی محبت کا داعی اپنی مکمل آزادی کا خواہاں ماں باپ کو اولڈ ہومز کی نذر کرتا ہے کیونکہ بوڑھے ترقی کے راستے کی روکاوٹ ہیں۔بچوں کو ڈے کیئر سنٹر کے حوالے کر دیا جاتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی روحیں نہ وقت کی اہمیت جانتی ہیں اور نہ آزادی کے مفہوم سمجھتی ہیں۔عمر بھر کا ساتھی جس سے بیماری ،تنگ دستی ،موت اور زندگی کے سفر میں ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا۔اس جیون ساتھی کو طلاق کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔تا کہ ترقی کے راستے میں تعلق کے روڑے نہ اٹکیں ۔تعلق کی سب توقعات سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔؛

امریکی شہری اپنی توقع کے ہار کو جلد گلے سے اتار پھینکتا ہے۔بچہ جلدی سمجھ جاتا ہے کہ ماں ایثار و قربانی دے کر اپنی شخصی آزادی تج کر اس کی پرورش نہیں کر سکتی ،وہ رونا شھوڑ کر ماں سے توقعات کو بھی بھولتا چلا جاتا ہے۔بوڑھے ماں باپ بھی توقع نہیں رکھتے کہ اولاد اپنی اپنی انگیاں بگاڑ کر بوڑھے والدین کو راجہ پورن بھگت کی طرح بیساکھی میں اٹھائے پھریں گے۔آزدی کے تصور سے ہمکنار ہو کر سفید فارم لوگ سب سے پہلے توقعات کی سیڑھی پر اترنا چڑھنا بند کرتا ہیں ،جب تعلق کا گرم کنبل جسم سے اترتا ہے تو ٹھٹرتے آدمی کو خود ہی جوگرز پہن کر جوگنگ کر کے اپنے وجود کی حرارت کو برقرار رکھنے کا فن آجات ہے۔پھر آزاد بندہ خود ہی ناظر اور خود ہی منظر بن جاتا ہے۔غم بھی اس کی خود ساختہ قرنبیق سے ٹکلتے ہیں اور آنسو بھی اسے پینے ہی گیلے

رومال میں جذب کرنا ہوتے ہیں۔بالآخر وہ اپنے وجود میں اس قدر تنہا وہ جاتا ہے کہ اس کے ہر عمل کی ذمہ داری اس کے

اپنے کندھوں پر آپڑتی ہے وہ نہ کسی کو الزام دے سکتا ہے نہ کسی سے کسی قسم کی توقع رکھ سکتا ہے۔اپنی تقدیر کا خالق اور اپنی Free Will کا آلہ ءکار عام طور پر ترقی کی سنہری پوستیں حاصل کرنے میں عمر بتا دیتا ہے اور ایسے Absurd حالات میں جہاں مسائل لاینحل ہوں ایسے اچانک فیصل ءکرتا ہے جس کا جواز بھی وہ خود اور زندگی کی انہونی کے ساتھ واحد رابطہ بھی اسی کی اپنی ذات ہوتی ہے۔آزادی کے رسیا زندگی کے چوراہے پر اپنی Free Will کے ہاتھوں Reflex Action کا شکار ہو جاتے ہیں۔سزا و جزا کی ذمہ داری قبول کر لینے کے بعد آزادی منش کو آنسو پی جانے کے علاوہ غم سے نپٹنے کا اور کوئی طریقہ بھی سوجھ نہیں سکتا۔تعلق کی بیساکھی پھینک دینے کے بعد مجبوری پھر بھی رہتی ہے،لیکن کسی کا ہاتھ پکڑنے بجائے self کی لاٹھی کے سہارے چلنا پڑتا ہے۔مشرق میں بھی کبھی کبھی مکمل آزادی کا راستہ چننے والیت مل جاتے ہیں،لیکن وہ ترقی کی خاطر ذات کی لاٹھی نہیں چنتے۔بلکہ مکمل آزدی حاصل کر کے فلاح کے راستے پر نکل جاتے ہیں۔یہ ایک اور طرفہ تماشا ہے۔مشرق میں جب کوئی صوفی ،جوگی تعلقات کی دھجیاں جوڑ کر رلی بناتا ہے تو اس گدی پر بٹھانے کے لیے اسے آواز دیتا ہے جو نظر نہیں آتا۔مکمل فراق کی زنجیر سے بندھ کر ہر تعلق ہر توقع توڑ کت جوگی کی آزادی پابجولاں ہو جاتی ہے۔یہاں ایک اوت تضاد کا بکھیرا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔اس میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگ جوق در جوق اس سے تعلق پیدا کرنے کے لیے حاضری دیتے رہتے ہیں لیکن وہ تعلق کے پھندے میں بھی پھنستے نہیں اور اپنی Free Will صرف اللہ کے امر کے سامنے بھینٹ شڑھا دیتے ہیں ۔صوفی ہر لمحہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ تعلق کے سمدر میں اپنی کشتی چھوڑ دے لیکن قطرہ بھر بھی کشتی کے اندر نہ آنے پائے۔اپنے غموں سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار

رہتا ہے۔اب اسے غم بھی قید نہیں کر سکتا۔وہ تعلق اور توقع سے فارغ ہو کر ایسی آزادی سے آشنا ہوتا ہے جو مکمل طور پر اپنی ذات کو راپن کرنے کا فن ہے، نہ آزادی کا شوق باقی رہتا ہے نہ تعلق کا۔

مہاتما بدھ مغربی آزادی اور مشرقی فلاح کی ایک بڑی مثال ہے۔جب یشو دھرا اور بچے کو چھوڑ کر سدھارا تو اس نے وہ تمام غم راجہ شدو دھن کے محل میں ہی چھوڑ دیئے۔جن سے عام آدمی رنج کی بھٹی میں سلگتا ہے۔یہاں سے مہاتما بدھ نے اپنے غموں کو خود ایجاد کیا۔ان غموں کو نروان کے راستے ختم کرنے کا ارادہ بھی اس کا اپنا تھا۔اس نے اپنی آزادی کو اس حد تک قبول رلیا تھا کہ اس نے نہ کسی انسان کو پکارا نہ کسی خدا کو۔وہ پہلا وجودی تھا۔اپنی Free Will پر وہ اس حد تک قابض ہو چکا تھا کہ اس نے تربیت کو بھی تعلیم میں ڈوب جانے کے بجائے تنہائی کا سبق دیا۔سدھارتھ کا فیصلہ تھا کہ اگر آپ مکمل طور پر آزاد ہیں تو پھر اپنے نروان کے لیے کوشش بھی نہ کیجیے۔دنیاوی ترقی مکمل فلاح کو ختم کر دے گی۔آزادی حاصل کرنے کے بعد اگر آپ خواہشات کے غلام دھر لیے گئے اور دائرے کا سفر شروع ہو گیا تو یہ تعلق خواہشات بھی سب سے بڑی غلامی ہو گی۔۔۔۔غلامی چاہے ترقی کی ہو یا فلاح کی غلام ہی رکھتی ہے۔مہاتما بدھ کا خیال تھا جب تک انسان ان دونوں سے آزاد نہیں ہوتا نروان ممکن نہیں۔دونوں صورتوں میں دینی یا دنیاوی خواہش کا پٹہ اتارنا پڑے گا۔

آزاد ہونے کے باوجود خواہشات آپ کو بازار مصر میں گھسیٹتی پھریں گی۔۔۔اور بہت جلد آپ کو علم ہو جائے گا کہ ترقی کی بانسری کے پیچھے بھاگتے بھاگتے آپ کسی تپتے صحرا میں پہنچ گئے ہیں۔عین مین ایسے ہی تعلق کی اصل بھی کبھی پورے طور پر سمجھ نہیں آسکتی۔دنیا بھر کا ادب اس گنجھل کو مکمل طور پر سیدھی لکیر میں تبدیل نہیں کر پایا۔لگتا ہے تعلق ہے۔پر نہیں ہوتا۔ہوتا ہے تو وقتی معجزہ۔۔۔۔وارد ہوا

اور پھر غائب ۔ سیماب پا، سراب صفت، پارے کی طرح اس کے ان گنت رنگ ہیں ۔ خوبیاں اور خرابیاں ہر رابطے، رشتے تعلق میں یوں گھدھی ہوئی ہیں کہ ان کا چھان پھٹک کرنا مشکل ہے۔ گہرے تعلق جیسے لیلیٰ مجنون، شیریں فرہاد، سسی پنوں، مرزا صاحباں سوہنی ماہیوال صرف اس تعلق کی کہانیاں ہیں، جوان عاشقوں کے مابین پیدا ہوا۔۔۔ وہ تعلق جوان افراد کے گھر والوں، دوستوں، شوہر بیوی کے درمیان تھا۔ اس کا ذکر نہیں ملتا۔ ہم ان کے تعلق کو بھی وقتی شدت کے اعتبار سے آنکتے ہیں۔ وقت کے لمبے دورانے پر اسے پھیلا کر دیکھنے سے قاصر ہیں اس لئے تعلق کی داستان بھی ادھوری ہے۔

ایک بات جوان عاشق زادوں کی مجھے سمجھ آئی کہ ان میں ایک دوسرے پر جذباتی Dependency کا یہ عالم تھا کہ محبوب کے بغیر زندگی صرف چھلکا تھی۔ خالی کھوکھا، بلکہ بن آکسیجن کے مستعار سانس۔ صحرا میں تلاش ہو یا تنہا نہر کھودنے کی صعوبت، کچے گھڑے کا سفر ہو یا اپنے ہی جس کے کباب بنا کر کھلانے کا عمل۔ یہ سارے تعلق اپنی جان سے گذر جانے والے تھے۔۔۔ ایسے تعلق سے غالباً فلاح کی دیوی بھی خائف رہتی ہے۔

میں نے کبھی اقبال کے لیے اتنا بڑا جز بہ نہیں پالا۔۔۔۔ یہ تو چولہے کی بجھی آگ کی طرح۔۔۔ ایسی ہوا کی منتظر رہتی جو راکھ اڑائے اور اند کے دہکتے انگارے پھر سلگ اٹھیں۔

اقبال ٹھیک کہتی ہے تعلق تیغ چھتری ہے۔ ہر جسمانی، ذہنی، جذباتی غم کے آگے شیشہ بن کر ڈھال کا کام دیتی ہے۔۔۔ بے روزگاری، بیماری، غریبی تنہائی سارے غموں پر تعلق کا ہی پہارا کھا جاتا ہے۔۔۔ دوستی رشتہ داری، بہن بھائی نانا دادا ۔۔۔ غرضیکہ ہر دکھ کی گھڑی میں کندھے پر رکھا ہوا ہمدرد ہاتھ، آنکھ میں جھلملاتی

شفقت، ایک میٹھا بول، مسکراتا چہرہ بلڈ ٹرانسفیوشن، اسپر کی گولی بن سکتے ہیں۔اسی لیے محبت اندوہ با کہلاتی ہے۔۔۔۔انسان اسی لیے کبھی خدا نہیں بن سکتا۔کہ اس کی ضرورت دوئی ہے حتیٰ کہ اگر اسے دورا نہ ملے تو وہ خدا کو اپنی دوئی کا حصہ بنا لیتا ہے۔۔۔انسان کی تنہائی قیامت خیز ہے۔۔۔جونہی اس خلاء کو بھرنے والا کوئی آجاتا ہے انسان اپنی جنت میں پہنچ جاتا ہے اور اپنے آپ کو مکمل سمجھنے لگتا ہے۔ساتھ نہ ہو تو زندگی آزاد دوزخ ہے۔

میں آزادی اور تعلق کے درمیان ترقی اور فلاح کے مابین رسہ کشی میں مصروف اونگھ سا گیا۔پھر کسی نے ہلکے سے میری گال کر تھپتھپایا۔

''نانا۔۔۔۔مجھے شوشو آیا ہے۔۔۔۔''

میں گڑبڑا کر اٹھا۔

''ہاں ہاں تو کرلو۔۔۔۔''

''میں نے سوتے وقت دانت بھی برش نہیں کیے تھے۔''

''ہاں تو کرلو شاباش۔۔۔۔''

''آپ مجھے پیسٹ لگا دیں گے پلیز۔ماما ہمیں خود پیسٹ لگا کر دیتی ہیں۔۔۔۔''

میں جمشید کے ساتھ غسل خانے میں چلا گیا۔اس کا چہرہ مجھے رویا رویا سا لگتا تھا۔یہ ماما لوگ بھی کیا چیز ہوتی ہیں؟۔ان کے بغیر بابا لوگ کا جی کیوں نہیں لگتا۔۔۔۔یہ کیسا تعلق ہے؟ گھاس کی طرح عام۔۔۔اور ماونٹ ایورسٹ کی طرح اونچا۔۔۔۔اسے ماں کی طرف سے ماتا کا نام دیا جسکتا ہے لیکن بچے کی جانب سے اسے کس نام سے پکاریں گے؟ اس مکمل انحصار کو کس نام سے پکاریں۔

غالباً فلاح کی دیوی نے کسی کو آج تک اس تعلق کا نام ایجاد نہیں کرنے دیا۔۔۔۔کیونکہ اسے خود ایسے ہی تعلق کی تلاش رہتی ہے۔جب وہ خدا کی بندے

سے محبت سے غافل اور خود اپنی ضرورت کے تحت بچے کی مانند خدا سے بندھی رہتی ہے۔فلاح کے اس تعلق کا ٹیکنیکل نام کیا ہے؟

ارجمند اور بلال کو جاپان گئے پورا ویک اینڈ گذر گیا، غالباً اقبال نے آنسرنگ مشین نہیں سنی تھی۔اس طرف سے نہ کوئی آیا نہ ہی کسی نے فون کیا۔پھر بھی میرکان فون کی گھنٹی پر لگے تھے۔رات کو جمشید اور قیصر دونوں میرے کمرے میں گدے لگا کر پڑے رہتے وہ ماں باپ کے بغیر بہت آزاد محسوس کر رہے تھے۔انہوں نے اپنی اپنی مرضی سے کئی بار آئیس کریم کھائی۔ڈنر کھانے کی بجائے فروٹ اور سیریل پر اکتفا کیا اور دبا کر جوس پیا۔میں انہیں دوپہر کے وقت مارکیٹ لے گیا جہاں انہوں نے ہر بار مرضی کے برگر اور چپس کھائے۔کھلونوں کی دوکان سے چھوٹے چھوٹے Batman سوپرمین قسم کے کھلونے خریدے۔قیصر چھوٹا تھا۔ابھی اسے کھلونوں میں تمیز کرنا نہیں آئی تھی۔اس نے ایک بار باربی ڈول خرید لی اسے علم نہ تھا کہ لڑکے گڈیوں سے نہیں کھیلتے۔جمشید نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا قیصر یہ لڑکیوں کا کھلونا ہے یہ تو گڑیا ہے" You Stupid روہانسا سا منہ بنا کر قیصر بولا۔۔۔۔"تو مجھے اچھی لگتی ہے نا۔۔۔۔کیوں نانا میں یہ Barbie لے سکتا ہوں۔۔۔۔اس کے لمبے بال مجھے بہت پیارے لگتے ہیں۔نرم نرم Shining۔"

"ضرور لے لو۔۔۔۔۔بڑوں کو بھی باربی اچھی لگتی ہے لیکن وہ منہ سے کہتے نہیں "۔

"تو کیا کرو گے اسے لے کر۔۔۔۔یہ پستول لے لو ناں اس میں پانی بھر کر شوٹ کرو تو پچکاری پڑتی ہے دوسرے کے منہ پر۔۔۔۔۔"

"نانا اس کے بال کتنے ملائم ہیں Just touch it میں اس کالے

Bear کے ساتھ سونا نہیں چاہتا۔میں اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا سو جاؤں گا۔۔۔۔"

جمشید ہنسنے لگا۔۔۔۔"ہاؤ فنی!۔۔۔۔۔"

"It not funny....."

"Its funny shit....."

قیصر نے ایک مکا جمشید کو مارا جس کے نتیجے میں شاید لڑائی بڑھ جاتی اور میں اسے کنٹرول نہ کر سکتا،لیکن اس وقت ایک پندرہ سولہ برس کی تین سو ساٹھ پونڈ کے قریب وزن والی امریکن لڑکی ان دونوں کے درمیان سے گزری اور مسکرا کر قیصر کی گال تھپکی دی۔اس موٹی باربی ڈول نے قیصر کا غصہ سرد کر دیا۔

رات کو قیصر اپنی باربی ڈول اور جمشید اپنی وائر گن کو اپنے ساتھ تکیوں پر دھرے کہنیوں کے بل لیٹے تھے۔

"نانا لاہور کیسا ہے۔۔۔۔"

"لاہور؟"

"ہاں نانا لاہور۔۔۔۔آپ کا لاہور۔۔۔کیا ہے؟"

"تم لاہور آ کر دیکھو تو پتہ چلے ناں۔۔۔۔لاہور کے تین حصے ہیں۔ایک شہر نیا ہے جو نہر کے بائیں طرف آباد ہے گلبرگ،ڈیفنس،ماڈل ٹاؤن۔یہاں پر امیر لوگوں کی بستیاں ہیں۔پھر دائیں طرف وہ شہر آباد ہیں جہاں سکول کالج بازار اور سرکاری افسروں کی وزیروں کی اور متوسط لوگوں کی ملی جلی آبادیاں ہیں۔مال روڈ ہے باغ جناح ہے اور پھر کچہری اور گورنمنٹ کالج سے آگے پرانا شہر ہے۔۔۔مغلیہ دور کی نشانیاں سکھوں کے عہد کی داستانیں یہاں ملتی ہیں تیسرے لاہور میں۔"

وہ دونوں حیران میری صورت دیکھنے لگے۔

"نانا ہم بالکل نہیں سمجھے۔۔۔۔"قیصر باربی کے سلکی پلاٹنم بالوں پر انگلیاں پھیر

رہا تھا۔

''اچھا میں تمہاری ماما سے کہوں گا اس بار بریک لے کر تمہیں پاکستان دکھا لائے۔میں تمہیں جہانگیر کا مقبرہ،شالامار باغ،بادشاہی مسجد دکھاؤں''

''ماما تو کہتی ہیں وہاں بہت گرمی پڑتی ہے۔۔۔۔''

''پڑتی ہے جیسی Texas میں Arkansas مین پڑتی ہے۔۔۔۔۔''

''اور مٹی بھی بہت ہوتی ہے۔ڈسٹ ہوا میں اڑتی رہتی ہے ہر وقت You cant breathe''

جمشید نے چھت کی طرف پانی کی پچکاری چلا کر کہا ''شٹ اپ''

''ہاں مٹی بھی ہوتی ہے۔۔۔کوڑا کرکٹ بھی ہوتا ہے جگہ جگہ مکھیاں بھی بھنبھناتی ہیں۔۔۔لیکن وہاں ایک اور چیز بھی ہوتی ہے بچوں۔۔۔۔بالکل نیچرل Organic''

''وہ کیا نانا۔۔۔۔۔Tell us''

''وہاں بھی اب وہ چیز کم ہوتی جا رہی ہے۔۔۔وہاں بھی لوگوں کے لیے کسی کو وقت دینا مشکل ہے۔۔۔وہاں بھی۔۔۔۔لیکن وہاں ابھی ایک دوسرے کے لیے وقت ہوتا ہے۔وقت جو سب سے بڑی Gift ہے۔''

میں چپ ہو گیا۔بھلا ان کو ایسی باتوں کی کیا سمجھ تھی۔انہیں تعلق کی کیسے سمجھ آسکتی تھی۔انہیں میں کیسے بتا سکتا تھا کہ سانده سے ٹمپل روڈ۔۔۔اور ٹمپل روڈ سے ڈیفنس کی رومن Pillars والی کوٹھی تک میں کتنا کچھ گنوا دیا۔میں بھی ان کو اپنے پانچوں بہن بھائیوں کی صرف پرانی کہانیاں ہی سنا سکتا تھا آنول تو کبھی کی کٹ چکی تھی کتنے رشتے وقت نہ ملنے کے باعث فل سٹاپ میں بدل گئے۔اماں ابا تو خیر قبروں میں جا سوئے۔ہم پانچوں بھی اپنی اپنی راہوں پر اپنے اپنے بچوں میں گم اپنے اپنے ساتھی کی انگلی

پکڑے زندگی کی بڑی بھیڑ مین گم ہو گئے تھے ۔زندگی میں دولت کمانے اور صرف کرنے کے ءعلاوہ ہمارا کوئی مصرف نہ رہا تھا ۔پہلے اس کے لیے تگ و دو کرنا اس کو خرچ کرنے یا جوڑے جانے میں مگن رہنا ۔ہاں ایک عہد سے تعلق باقی تھا ۔پھورا جیسا کی طرح تعاقب کرنے والا لیکن اس اقبال جرم کا مین ساری عمر کوئی نام نہ رکھ سکا ۔جسے بچے ماں سے محبت کو کسی کاص نام سے نہیں پکارتے ۔مین نے کارڈلس فون پاس رکھلیا'' بھئی سو جاؤ ماما نے کہا تھا ۔دیر تک نہیں جاگنا ۔

اقبال کے فون کا انتظار رہا ۔لیکن مجھے انتظار کے سوائے کچھ نہ ملا ۔بچے دیر بعد سو گئے ان کے پاس اپنا اپنا سہرا ٹیڈی بیئر اور باربی ڈول کی صورت میں موجود تھا ۔میں فقط ایسے چونگے کے سہارے سونے کی کوشش کر رہا تھا جس سے سوکھے نلکے کی سائیں سائیں کے علاوہ کوئی آواز نہ آتی تھی ۔

اصغری کے مرنے کے بعد میرا گھر اسی ٹیلی فون کی طرح بھائیں بھائیں سائیں سائیں کیا کرتا میرے دونوں بچے امریکہ جا چکے تھے ۔وہ سمجھتے تھے کہ انسان اس دنیا میں صرف دولت کمانے کے لیے آیا ہے، امریکہ کی بھیڑ میں گم ہوتے انہیں دیر نہ لگی کیونکہ وہ فلاح کے گاہک نہ تھے دولت کے بغیر زندہ رہنے کو ننگ زندگی سمجھتے تھے ۔انہوں نے ترقی کی دیوی کے آگے سر جھکا دیا تھا ۔

اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ ارجمند اور جہانگیر جب امریکہ سدھارے تو اصغری ذہنی طور پر غائب حاضر ،ملول اور خوفزدہ رہنے لگی تھی ۔میں اس کے لیے ناکافی تھا ۔پہلے مجھے اپنی کم مائیگی کا کچھ ایسا گہرا احساس نہیں تھا لیکن ارجمند اور جہانگیر کے بر دگھر بالکل سونا ہو گیا اور میں کافی نہ رہا ۔۔جب تک جہانگیر امریکہ نہ گیا ہم دونون اسے ملنے جاتے رہے ۔شادی کے بعد جہانگیر کے ساتھ احتیاط کا رشتہ تھا ۔چھلک جانے کا